بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

علماء کرام سے خطاب

"العلماء ورثۃ الانبیاء" اور "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" لفظوں کے اعتبار سے مستند و روایت کے لحاظ سے قابلِ وثوق نہ سہی لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ یہ اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے درست ہیں۔ اور اگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام مسلمانوں کی ہمہ گیر قیادت و رہبری کا شرف صرف علماءِ اُمت کو حاصل ہے، تو علماء کرام کو بڑی سنجیدگی اور روشن ضمیری کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کی ضرورتیں کیا ہیں، اُن کو دینی اور دنیوی لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے، اور اُن کی تکمیل کے ذرائع کیا ہیں؟

جب سے ہندوستان کے مسلمانوں پر ذہنی و دماغی تنزل کا ادبار مسلط ہوا ہے، بدقسمتی سے مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ کر علماء و غیر علماء تعلیم یافتہ اصحاب کے حدود عمل و اختیار کی تحدید کر دی گئی ہے۔ اور یہ خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے کہ علماء کا دائرۂ عمل صرف وعظ و درس اور افتاء تک محدود ہے، اُن کی علمی وسعتوں کو سمیٹ کر خانقاہوں اور مدرسوں میں، مسجدوں اور افتاء کے مکانوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عہد عروج و ترقی میں علماء پر یہ پابندیاں عائد نہیں تھیں وہ جس طرح مدرسوں میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے ملکی و سیاسی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں بھی اُن کا

ناخن تدبیر موثر ثابت ہوتا تھا، وہ جس طرح خانقاہوں میں بیٹھ کر تزکیۂ روح اور تصفیۂ نفس کی خدمت انجام دیتے تھے، اور وعظ و ارشاد کے منبر پر لوگوں کی ہدایت کا سامان کرتے تھے اپنے قبضہ میں قلمدان وزارت اور محکمۂ قضا کی مہر عدالت بھی رکھتے تھے، اُن کے فیصلے جس طرح مذہبی و دینی امور میں ناقابل انکار ہوتے تھے، ٹھیک اُسی طرح ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں اُن کی آرا قول فیصل کا حکم رکھتی تھیں۔ ہر شخص کے تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ایک مخصوص نصاب کی تکمیل ضروری تھی۔ جو اُس کو مکمل کر لیتے تھے "عالم" کہلاتے تھے، خود تعلیم یافتہ طبقہ آج کل کی طرح "جدید تعلیم یافتہ" اور "قدیم تعلیم یافتہ" کے دو طبقوں میں منقسم نہیں تھا اپنے اپنے رجحانِ طبعی کے باعث کسی نے کسی خاص علم و فن میں مہارت پیدا کر لی تو وہ اس کی طرف منسوب ہو کر فقیہ، محدث، مفسر، فلسفی، متکلم، یا مورخ کہلانے لگا لیکن ہمارے زمانہ کی طرح یہ نہیں تھا کہ تعلیم کو قدیم و جدید کی دو اصطلاحوں کے ماتحت دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہو اور اُن میں سے ہر ایک کے لیے الگ نصاب تعلیم، الگ درس گاہ، الگ طریق تعلیم اور الگ طریق بود و ماند ہو، اور اُن میں افتراق و تشتت کی ایسی خلیج حائل ہو کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کی تعلیم کو اپنے لیے شجرۂ ممنوعہ قرار دیتا ہو۔ جہاں تک اسلامی تعلیم کے نصاب کا تعلق ہے وہ ہر ایک کے لیے یکساں تھا، درس گاہیں ایک تھیں۔ مدرسہ اور کالج، جامع اور یونیورسٹی، حجرہ اور روم، ان میں سے کسی کی تفریق نہیں تھی۔

کیا کبھی علماء کرام نے غور فرمایا ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے آج عوام میں اُن کو سیاست سے ناآشنا، بین الاقوامی ضرورتوں سے بے خبر اور اجتماعی و تمدنی مسائل سے بیگانہ فرض کر لیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علماء کا یہ سیاسی یا تمدنی اچھوت پن بڑی حد تک اُس برطانوی حکمت عملی کا رہینِ منت ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیم سے متعلق اختیار کی گئی اور جس کو نافذ کرنے کے لیے برطانوی مدبرین و اہل قلم نے اپنی تمام کوششیں ایک مرکز پر جمع کر دیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات علماء کو اُن کے گوشۂ تنہائی سے باہر کھینچ

لائی، ورنہ سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے ان کی حیثیت صرف عیسائیوں کے پادریوں اور پوپوں کی طرح تھی جو گھر بیٹھے ہوئے یا گرجا میں پہنچ کر انجیل سنا دیتے ہیں کسی کو دعائیں دیدیتے ہیں، نکاح کی رسم ادا کرا دیتے ہیں۔ یا مرتے وقت اقرار گناہ (Confession) کرا لیتے ہیں اور بس! لیکن اگر ذرا وقتِ نظر اور انصاف سے کام لیا جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ علماء کا یہ خمول وگمنامی صرف دستِ قاتل کا منت کشِ احسان نہیں بلکہ اس میں تھوڑا بہت "شائبہ خوبی تدبیر" بھی تھا۔

یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب ہم کو سوچنا یہ ہے کہ اگر واقعی علمار کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ اور اسلامی تہذیب اصول کے مطابق اُن کو ایسے راستہ پر چلائیں جو اُن کے لیے حسنات دینی و دنیوی کا باعث ہو۔ اور جس سے منحرف ہونا اُن کے لیے پیام ہلاکت ثابت ہو سکتا ہو۔ تو سب سے پہلے ہم کو اس کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ ہم آج کس ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان مخصوص حالات میں ایک ترقی یافتہ قوم بننے کے لیے ہم کو کن کن امور کی ضرورت ہے، اور اُن سب کی کفالت و ذمہ داری کا بارگراں علمار کرام کس طرح اپنے ذمہ لے سکتے ہیں۔ دراصل یہ چند سوالات ہیں جن پر آج کی صحبت میں غور کرنا ہے۔

آج ہندوستان کے مسلمان ایک مخصوص سیاسی نصب العین کے ماتحت اپنی تنظیم کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس راہ میں علمار کرام ان کی قیادت و پیشوائی کا فرض بقدر وسعت و استطاعت ایثار و فداکاری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ ہم آج جس ماحول میں گرفتار ہیں اور عرصۂ مدید کی غلامی نے ہم کو انحطاط و پستی کے جس نقطۂ حضیض پر پہنچا دیا ہے اُس کے پیش نظر ہمارا فرض صرف سیاسی تنظیم پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اس وقت ہماری مثال بالکل اُس مریض نیم جان

ناتواں کی سی ہے جو عرصہ دراز تک کسی مہلک مرض میں مبتلا رہنے کے باعث اپنے اعضاءِ رئیسہ کی تمام طاقتوں اور صلاحیتوں کو گم کر بیٹھا ہو۔ ظاہر ہے اگر ایسے مریض کو تندرست انسانوں کی برابر لاکھڑا کرنے کے لیے کسی تدریجی اصلاح کے بغیر مقوی گولیاں اور دوائیں استعمال کرائی جائینگی تو ممکن ہے اُس کا عارضی فائدہ یہ ہو کہ وہ اُن دواؤں کے اثر سے تھوڑی دیر کے لیے کھڑا ہو جائے اور تندرست انسانوں کی طرح نقل و حرکت کرنے لگے لیکن اگر اصل مرض کا ازالہ نہیں ہوا ہے تو لازماً اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مقوی دواؤں کا اثر زوال پذیر ہوگا، مریض کے قدم لڑکھڑا جائینگے اور وہ پھر صاحب فراش ہو جائیگا۔ آج جس سیاسی تنظیم کا غوغا بلند ہے، تشبیہ و استعارہ کی زبان میں اُس کو "مقوی گولی" سمجھیے اور بتائیے کہ اگر مسلمانوں کی موجودہ اقتصادی بدحالی، جہالت، توہمات پرستی، معاشرتی پراگندگی کا عالم یہی رہا تو کیا صرف اس ایک گولی کا استعمال آئندہ نتائج کے اعتبار سے اُن کے لیے خوشگوار ثابت ہو سکتا ہے؟ ہم میں ایسے خوش فہم حضرات کی کمی نہیں ہے جو صرف سیاسی تنظیم کو قوم کے تمام امراض کا درماں سمجھتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو حق یہ ہے کہ معاشرتی اور تمدنی تنظیم پر ہی سیاسی تنظیم کی بنیاد قائم نہیں ہوتی، کسی قوم میں صحیح طور پر سیاسی صلاحیت پیدا ہوتی ہی اُس وقت ہے جبکہ اُس میں معاشرتی، تمدنی، مذہبی اقتصادی اور اجتماعی اعتبار سے ایک ہم آہنگی، پختگی اور قوت و عمدگی پائی جاتی ہو۔ جو غیر منظم جماعتیں کسی ہنگامی جوش و خروش سے ایک مقام پر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی عجیب و غریب حادثہ کے رونما ہوتے ہی سرعت کے ساتھ پراگندہ بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسی جماعتوں کے ہاتھ میں اگر سیاسی قوت آبھی جائے تو چنداں دیرپا ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ اُن میں اُس قوت کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے اِس کے برخلاف جو جماعتیں ایک مستحکم اور صالح رابطۂ قومیت سے وابستہ ہوتی ہیں وہ اپنی جدوجہد سے آزادی و سربلندی حاصل کرتی ہیں اور پھر اُس کو محفوظ و مامون رکھنے پر قادر بھی ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے ایک نامور لیڈر نے حال میں ہی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر مسلمان تباہ ہو رہے ہیں تو ہو جائیں۔ بہر حال ہم اپنے دشمنوں سے لڑنا نہیں چھوڑیں گے اور اسی طرح لڑتے لڑتے ختم ہو جائیں گے" ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ایسا مایوسانہ جملہ ہے جس کو کسی باعمل مخلص، اور انصاف پسند مسلمان کی تائید حاصل نہیں ہو سکتی، ہمارا اصل کام لڑنا نہیں، اپنے تئیں قوی اور مضبوط بنانا ہے، ہاں البتہ اس راہ میں جو قوت ہم سے متصادم ہوگی ہم اُس سے ٹکرائیں گے۔ اور یا خود فنا ہو جائیں گے یا اپنے دشمنوں کے حوصلوں کو پست کر دیں گے۔ اور اُنہیں مجبور کریں گے کہ وہ ہم سے صلح و آشتی کا معاملہ کریں اسی طرح ہم صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی دعوت دیتے وقت زورِ تقریر میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ "ہندوستان آزاد ہو جائے۔ اس کے بعد اگر مسلمان ہندو کا غلام ہو کر رہے بھی تو مضائقہ نہیں۔ انگریز کی غلامی سے تو نجات پا جائیگا۔ اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے ہمسایہ اسلامی ممالک تو انگریز کے خوف سے مامون ہو جائیں گے" ہمارا مقصد ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں، بلکہ ہمارا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ اور مسلمان اُس میں بہ حیثیت ایک طاقتور، شریک جمہوریت، اور ترقی یافتہ قوم کے زندگی بسر کریں۔ ہم دوسری قوموں میں جذب ہونا پسند نہیں کر سکتے بلکہ اُن کے ساتھ اپنی مستحکم قومیت کی بنیادوں پر شرکتِ عمل کر کے جنگ آزادی میں لڑنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ان جملوں کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس وقت مسلمان حصول آزادی کی جد و جہد کو چھوڑ کر اپنی اندرونی اصلاح میں لگ جائیں بلکہ منشا یہ ہے کہ ہمیں اپنا مطمح نظر صرف سیاسی تنظیم کو ہی بنا کر اندرونی اصلاح کے دوسرے اہم تعمیری کاموں سے بھی غافل نہ رہنا چاہیے۔ آپ مریض ناتواں کو طاقت کی گولیاں استعمال کرا رہے ہیں تو شوق سے کرائیے۔ مگر ساتھ ہی اُس کے اعضاء رئیسہ میں تدریجی عمل کے ذریعہ ایسی صلاحیت پیدا کر دیجیے کہ مریض پر طاقت کی گولیوں کا رد عمل نہ ہو۔ اور وہ اُن کے استعمال سے

پیدا شدہ طاقت و قوت کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکے، جو جماعتیں اس وقت ایک زبردست سیاسی انقلاب کے لیے مصروفِ عمل ہیں، اُن سے اس قسم کی تعمیری اصلاح میں مدد نہیں مل سکتی۔ کیونکہ اُن کے نقطۂ نگاہ سے یہ سب کام انقلاب کے بعد کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر اگر آپ ان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو آپ کو اپنے لیے ایک ایسا اہم مرکزی نظامِ اجتماعی بنانا ہوگا۔ جس کے ماتحت آپ اپنی قومیت کی بنیاد قوی سے قوی تر کر سکیں۔ ہم کو ۱۸۵۷ء سے سبق لینا چاہیے" یہ ہنگامہ دراصل انقلاب کی ایک سرگرم کوشش تھی جو حالات کی ناموافقت کے باعث نتیجۃً ناکامیاب رہی، کیوں؟ محض اس بنا پر کہ انگریزوں کے مظالم اور سلطنت اسلامی کی تباہی کے حسرت انگیز منظر نے ہماری رگوں میں فوری طور پر انتقام کا جوش پیدا کر دیا تھا، لیکن چونکہ ایک عرصہ دراز کے جمود و تعطل نے ہمارے شیرازۂ جمعیۃ کو پریشان کر رکھا تھا، اور اُس وقت ہم میں معاشرتی شیرازہ بندی کا وجود مضمحل ہو رہا تھا۔ اس لیے ہمارا ولولۂ انتقام انگریزی بلاخیز توپوں کے بالمقابل زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکا۔ اگر ماضی کی کوئی داستان حال کے ہنگامۂ کارزار میں ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے، تو ہمیں بیدار مغزی، عاقبت اندیشی اور وقت کی صحیح نبض شناسی سے کام لے کر سیاسی تنظیم کے دوش بدوش اپنا ایک ایسا مرکزی نظام بنانا چاہیے جو تمام قومی ضرورتوں کی تکمیل پر حاوی ہو، اور اُس کے لیے سیاسی سرگرمی بلکہ اُس سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جانا چاہیے۔ یہ سب کام علماء کے ذمہ ہیں اور اُنہی کو رہبری کی مشعل فروزاں لے کر مسلمانوں کی قیادت کرنی ہے۔

آج ہم اس پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ صحبت میں بتائینگے کہ اس مرکزی نظام کے عناصر ترکیبی کیا ہونگے اور اُن کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے، اور اس راہ میں جو دشواریاں ہیں اُن سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

یوسف بکنعاں!

اُس خدائے قادر و توانا کے بے انتہا فضل و کرم کا شکر کس زبان و قلم سے ادا کریں جس نے آج ہماری آنکھوں کو پھر اُس "یوسف گم گشتہ" کے دیدار پُرانوار سے منور کر دیا جس کو دیکھنے اور اُس کی باتیں سُننے کی آرزو میں تڑپتے ہوئے کامل پچیس برس گذر چکے تھے۔ اب سے چھ ماہ قبل کس کو خبر تھی کہ اس غیر معین الوقت بُعد و ہجران کے بادل یک بیک پھٹ جائینگے اور ہمارا خورشید تمنا جس کو لوگ "مولانا عبیداللہ صاحب سندھی" کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں افق کراچی پر طلوع ہو کر جلد ہم تک پہنچ جائیگا۔ پہلے جس کا تصور بھی ایک خواب پریشاں معلوم ہوتا تھا، زہے نصیب کہ آج وہ ہمارے سامنے ایک روشن حقیقت بن کر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ آہ کاش! آج قدس آشیاں حضرت شیخ الہندؒ اس عالم ناسوت میں تشریف فرما ہوتے اور خود دیکھتے کہ اُن کی درس گاہِ ارشاد و ہدایت کا فرزند جلیل اُن کی چشمِ بصیرت کا جگمگاتا ہوا تارہ، دنیائے اسلام کا مجاہد عظیم، حریت و آزادی کا داعیٔ کبیر مردانِ حق کوش و حق آگاہ کا قافلہ سالار پچیس سال کی انتہائی صبر آزما جلا وطنی کے بعد پھر اُن کے مشن کی تکمیل کے لیے ہندوستان میں آگیا ہے۔ فقر و فاقہ اور غربت و افلاس کے عالم میں ملک ملک کی بادیہ پیمائی نے اور لیل و نہار کے تغیرات نے اگرچہ اُس کو عمر کی منزل سبعین تک پہنچا دیا مگر اُس کا ولولۂ کار، عزم و حوصلہ کا جوش و خروش، اور ہمت و جستجو کی پرواز بلند اب بھی پہلے کی طرح شاداب و پُر شباب ہے۔ آج جس وقت یہ سطور قلمبند کی جا رہی ہیں اس سے چند گھنٹے قبل حضرت موصوف ندوۃ المصنفین کے دفتر میں ہی تشریف رکھتے تھے اور اپنے خدام کو افاداتِ عالیہ سے مستفیض فرما رہے تھے، دعا ہے کہ حق تعالیٰ آں موصوف کو دیر تک مسلمانانِ ہند کی صحیح رہنمائی کے لیے زندہ و سلامت رکھے، کہ ملکی سیاسیات کے اس نازک دور میں جبکہ مسلمانوں کی کشتی ایک تجربہ کار باعزم و بلند حوصلہ ناخدا کے انتظار میں گرداب بلا میں چکر کھا رہی ہے، آپ کی ہستی مسلمانوں کے لیے اُمید کا بہت بڑا سہارا ہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!